اردو زبان کی تاریخ کا خاکہ

مسعود حسین
۳۰ دسمبر ۱۹۹۶

اُردو زبان کی تاریخ کا خاکہ

(باضافہ و ترمیم)

مسعود حسین
(سابق صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

سرسیّد بک ڈپو، جامعۂ اُردو علی گڑھ

سن طباعت ــــــــــــــــ ۱۹۸۴ء
تعداد طباعت ــــــــــــــــ ایک ہزار
طابع ــــــــــــــــ سرسید بک ڈپو۔ علی گڑھ
ناشر ــــــــــــــــ سرسید بک ڈپو۔ علی گڑھ
قیمت ــــــــــــــــ دو روپے پچاس
کتابت ــــــــــــــــ غنیق احمد
طباعت ــــــــــــــــ نیو پبلک پریس دہلی

مسعود حسین

اُردو زبان کی تاریخ کا خاکہ[1]

۱۔ دنیا کی زبانوں میں اُردو کا مقام

۲۔ ہندوستان کی آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ

(الف) عہدِ قدیم (۱۵۰۰ ق۔م تا ۵۰۰ ق۔م)

(ب) عہدِ وسطیٰ (۵۰۰ ق۔م تا ۱۰۰۰ء)

(ج) عہدِ جدید (۱۰۰۰ء تا ۱۹۰۰ء)

۳۔ ہندوستان کی جدید زبانوں کی گروہ بندی

۴۔ ہندوستانی (اُردو) زبان کا عہد بہ عہد ارتقا

---

[1] مضمون پروفیسر مسعود حسین کی تحقیقی تصنیف "مقدمہ تاریخ زبانِ اُردو" کا عام فہم خلاصہ ہے، جسے مصنف نے خود تیار کیا ہے۔

۱- دنیا کی زبانوں میں اُردو کا مقام

دنیا کی تمام چھوٹی بڑی زبانوں کی مجموعی تعداد کا اندازہ آٹھ، نو سو کے قریب لگایا جاتا ہے۔ اِن زبانوں کو ماہرینِ لسانیات نے ان کی بناوٹ اور صوتیات کے اعتبار سے بارہ چھوٹے بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ زبانوں کی یہ گروہ بندی آخری اور قطعی بات نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ زبانوں کی یہ تقسیم کتنی ہی نامکمل سہی، ماہرینِ لسانیات کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

دنیا کی زبانوں میں اُردو کے صحیح مقام کو جاننے کے لیے اور اس کے رشتہ کا ٹھیک ٹھیک پتہ چلانے کے لیے ذیل میں چند اہم خاندانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) ہند یورپی خاندان :- یہ خاندان اُردو زبان اور لسانیات دونوں کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ اُردو زبان کا تعلق براہِ راست اِسی خاندان سے ہے۔ اس خاندان کی زبانیں شمالی ہندوستان، افغانستان، ایران اور یورپ کے تقریباً ممالک (انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی، یونان وغیرہ) میں بولی جاتی ہیں۔ سنسکرت پالی، قدیم، فارسی، یونانی، لاطینی وغیرہ قدیم زبانیں اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ آج کل اِسی خاندان سے تعلق رکھنے والی ایک زبان یعنی انگریزی تمدنِ انسانی کا سب سے زبردست کارنامہ بن گئی ہے۔ شمالی ہند میں بولی جانے والی ہند یورپی زبانوں کے ذیلی خاندان کو ہند آریائی کہتے ہیں۔ یہ ایک ذیلی شاخ ہے "ہند ایرانی" کی۔

(۲) سامی خاندان :۔ تہذیب وتمدّن کے قدیم گہوارے شام، لبنان وغیرہ کی پرانی زبانوں عبرانی اور سریانی کا تعلق اِسی خاندان سے تھا موجودہ عربی انھیں کی جانشین ہے۔ عرب فتوحات کے ساتھ ساتھ اس خاندان کو فروغ حاصل ہوا اور یورپ و ایشیاء کے دوردراز گوشوں میں پھیل گئی جہاں یہ آج بھی ہندیورپی زبانوں سے گتھی نظر آتی ہے۔ اکثر ہندیورپی زبانوں (مثلاً فارسی اور اردو) پر اس کی اتنی گہری چھاپ پڑی ہے کہ ان کی شکلیں پہچان نہیں پڑتیں۔ اسلامی علوم کا سرچشمہ ہونے کی وجہ سے یہ مذہب کا سہارا لے کر ابھی تک آریائی زبانوں کے علاقوں میں گھر کئے ہوئے ہے۔

(۳) تورانی خاندان :۔ اِس خاندان کی زبانیں منگولیا، منچوریا اور سائبیریا کے وسیع میدانوں میں بولی جاتی ہیں۔ ترکی یا تاتاری زبان اِن میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ترکوں اور مغلوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ اس کا عروج ہوتا ہے چنانچہ اُردو میں بھی ترکی الفاظ کا خاصا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

(۴) دراوڑ خاندان :۔ اس خاندان کی زبانیں جنوبی ہند میں بولی جاتی ہیں تمل، تلگو، کنڑ اور ملیالم اس کی خاص زبانیں ہیں۔ تلگو کے بعض الفاظ دکنی اُردو میں پائے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا خاندانِ السنہ کے علاوہ دوسرے غیر متعلقہ خاندانوں کی فہرست یہ ہے۔

(۵) تبتی چینی خاندان : (٦) افریقہ کے ہمیٹک، بنٹو، زبانوں کا خاندان (۷) آسٹریلیا، امریکہ کی بولیوں کے خاندان وغیرہ۔

ہندیورپی خاندان کی مختلف زبانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد محققین اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اس خاندان کی تمام زبانیں کسی ایک قدیم زبان سے

نکلی ہونگی۔ یہ اصل زبان کیا تھی، اس کے بولنے والے کہاں بستے تھے
کس طرح یورپ و ایشیا کے وسیع براعظموں میں پھیلے؟ آریوں کے من
ایسے سوالات ہیں جن پر ابھی تک اتفاقِ رائے نہیں ہو سکا ہے۔ علمی تحقیق
اختلاف کی کس درجہ گنجائش ہے، اس کا اندازہ ان مختلف نظریوں کا م
کرنے کے بعد ہوتا ہے جو آریوں کے اصل وطن سے متعلق پیش کئے جاتے ہ
ان کا سلسلہ ہندوستان (ہمالیہ) سے شروع ہو کر ہندوکش، تبت، کاک
وسطِ ایشیا، جنوبی روس، بحیرۂ بالٹک، اسکنڈے نیویا، آسٹریا، ہنگری
سائبیریا پر ختم ہوتا ہے۔

آریوں کی قدیم کتابوں میں ان کے اصل وطن کے متعلق کوئی اشار
ملتا۔ جدید ترین تحقیق کے مطابق قرونِ اولیٰ میں ہند یورپی زبان و تمدن کا گہ
جنوبی روس کے وہ وسیع میدان ہیں جن کا سلسلہ ایک طرف جرمنی اور پولینڈ
ملتا ہے اور دوسری طرف وسطِ ایشیا کے سلسلہ ہائے کوہ سے۔ تاریکی دھند لک
یہ آریا قبائل مغرب اور جنوب مشرق کی طرف پھیلنا شروع ہوتے ہیں جو گ
مغربی یورپ میں داخل ہوتا ہے۔ وہ مختلف شاخوں میں بٹ کر کل یورپ میں ک
جاتا ہے۔ دوسرا گروہ شمالی ایران میں داخل ہوتا ہے۔ چنانچہ آریوں کو تاریخی روشنی
ہم سب سے پہلے شمال مغربی ایران میں (۲۰۰۰ ق۔م) کے لگ بھگ دیکھتے ہیں۔ ہندوس
میں آریوں کے داخلہ کی تاریخ ۱۵۰۰ ق۔م مقرر کی جا سکتی ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ ہن
یورپی زبان بولنے والے آریا اپنے داخلۂ ہندوستان سے قبل عرصہ تک ایران مید
قیام کر چکے ہوں گے، جہاں اُن کی زبان ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی "ہند یو
سے "ہند ایرانی" منزل پر پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستان کے زرخیز میدانوں میں آری
کا داخلہ کسی منظم سیاسی تحریک کی شکل میں نہیں ہوا۔ اس میں جہاں گیری

زیادہ جہاں پیمائی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

ہندوستان میں آریوں کا سابقہ دراویدی قوموں سے پڑا جنھیں زیر کرنے میں انھیں کافی جد وجہد کرنی پڑی۔ اس جد وجہد کی جھلک رگ وید کے منتروں میں پائی جاتی ہے۔ موجودہ ہندی تمدّن خالص آریائی تمدّن نہیں کہا جاسکتا۔ فاتح اور مفتوح دونوں آخر میں ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ نئے تاریخی انکشافات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نو وارد آریوں کا سابقہ ہندوستان میں ایک ایسی متمدّن قوم سے پڑا جو کئی لحاظ سے ان صحرانوردوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ چنانچہ موجودہ ہندی تمدّن کے (اور زبان کے بھی) بیشتر بنیادی عناصر اسی قدیم تمدن کی یادگار ہیں۔ آریوں نے دراویدی مذہب کی بہت سی رسومات کو بھی اپنایا۔ بعض دیوی دیوتاؤں کے تصوّرات (مثلاً ہنومان جی کا تصوّر) خالص دراویدی ہے جہاں تک زبان کا تعلق لسانی تحقیق کے نقطۂ نظر سے یہ حصہ بالکل تاریکی میں ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ابتدائی پراکرتوں کی پیدائش دیس کی انھیں بولیوں کی گود میں ہوئی ہوگی۔ قدیم غیر آریائی تمدّن کی سب سے بڑی دین دیرہمی رسم الخط ہے، جو آج ہندوستان کی تمام زبانوں کی لکھاوٹوں (الّا اردو اور کشمیری) کا ماخذ ہے اور جسے آریوں نے شروع سے اپنی زبانوں کے لیے استعمال کیا ہے۔

۲- ہندوستان کی آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ

(الف) عہدِ قدیم (۱۵۰۰ ق۔م تا ۵۰۰ ق۔م)

ویدک زبان، سنسکرت اور پہلی پراکرت

آریائی زبان کے ارتقاء کا پہلا مستند نقش ہمیں رگِ وید (۱۵۰۰ ق م) کی شکل میں ملتا ہے۔ اس وقت "ہند یورپی" زبان "ہند ایرانی" منزل سے گزر کر خالص "ہند آریائی" شکل اختیار کر چکی تھی چنانچہ مشرقی ایران سے لے کر ہندوستان تک اس لسانی ارتقا کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ رگِ وید کے مختلف حصوں کی تصنیف مختلف زمانوں اور مختلف مقاموں پر ہوئی ہے۔ اس کے کچھ اشلوک قندھار (گندھار) میں لکھے گئے۔ کچھ دریائے سندھ کے کنارے اور کچھ جمنا کی وادی میں۔ اس شک نہیں کہ آریا ابھی دریائے سندھ تک ہی پہنچ پائے تھے کہ ان کی زبان نے ادبی شکل اختیار کر لی تھی۔ لیکن "رگِ وید" کے بیشتر اشلوک اسی غیر مصنوعی اور سادہ زبان میں ہیں جو اس وقت آریوں کے گھرانوں میں بولی جاتی تھی۔ دریائے سندھ سے آریہ جوں جوں آگے بڑھے اُن کی زبان پر صوبجاتی اور دیسی بولیوں (کول، دراویدی، آسٹرک وغیرہ) کا بھی اثر پڑا۔ یہ اثر صرف تلفظ تک محدود نہیں بلکہ دیسی الفاظ کا میل بھی ہونے لگا تھا۔ مثلاً ذیل کے الفاظ، کال (وقت) کنڈ، نیلا، پوجا، پھل، بل،

بیج، مور، رات، روپ وغیرہ ہندوستان کی دیسی بولیوں کے لفظ ہیں۔ رفتہ رفتہ ملک کے دور دراز حصوں میں پھیلنے اور غیر آریہ اقوام سے ربط وضبط بڑھنے کی وجہ سے آریوں کی زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہونے لگی۔ تلفّظ اور الفاظ کے استعمال کا فرق ناگزیر ہو گیا۔ بعض جگہ الفاظ کو اجنبی ماحول کی صوتیات سے متاثر ہو کر توڑ مروڑ دیا جاتا تھا۔ مشرقی ہندوستان میں غیر آریہ اقوام کی کثرت کی وجہ سے یہ لسانی تبدیلیاں تیزی سے نمایاں ہونے لگیں ... ۱ ق۔م سے ۶۰۰ ق۔م تک آریہ شمالی ہند میں پنجاب سے لے کر بنگال تک پھیل چکے تھے اور ان کی زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ اس عہد کی زبانوں کی گروہ بندی حسب ذیل انداز میں کی جا سکتی ہے۔

(۱) اُدیچہ: شمال مغربی ہندوستان کی زبان۔

(۲) مدھیہ دیشیہ: مدھ دیش، انبالہ سے الہ آباد تک کی زبان۔

(۳) پراچیہ، مشرقی ہندوستان، بنگال بہار وغیرہ کی زبان۔

شمال مغربی ہندوستان کی زبان کو اس زمانے میں اِس لحاظ سے فوقیت حاصل تھی کہ وہ آریوں کی قدیم معیاری زبان سے زیادہ قریب تھی۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں یہی زبان زیادہ صحیح اور کھری سمجھی جاتی تھی۔ مشرقی ہندوستان کے رہنے والوں کو شمال مغربی ہندوستان کے آریہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کو بھوت پریت کی نسل سے تعبیر کرتے تھے۔ اُن کی زبان کو اشُدھ کہا گیا ہے۔ اِس میں "ر" کی آواز "ل" میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ موجودہ بہاری بولی میں بھی پایا جاتا ہے کہ 'راجا' کا 'لاجا' اور 'کھیر' کا 'کھیل' ہو جاتا ہے۔ مدھیہ پردیش (دو آبہ) کی زبان کے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں۔ یہاں کی زبان نہ تو پنجاب کی بولی کی طرح معیاری سمجھی جاتی تھی اور نہ اس قدر ذلیل و پست جتنی کہ

پورب کی بولی۔ بلکہ جوں جوں آریائی تہذیب کا مرکز پنجاب سے ہٹ کر دوآبہ ہوتا گیا یہاں کی زبان کو بھی ممتاز حیثیت دی جانے لگی۔

اسی زمانے میں آریائی زبان کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔ صوبجاتی اور مقامی تعصّبات سے الگ ہٹ کر صرف ایسے الفاظ کو ٹکسالی مانا گیا جو سب جگہ رائج ہوں۔ سب لوگ ادب میں ایک خاص قسم کی ٹکسالی زبان کا استعمال کرنے لگے اور یہ زبان بن سنور کر سنسکرت (شدھا) ہو گئی۔ جو درجہ آجکل ہندوستانی کو حاصل ہے یا جو عہد پراکرت میں مہاراشٹری کو حاصل ہوا، وہی درجہ اس زمانے میں سنسکرت کو حاصل تھا۔ ملک کے جن جن حصوں میں آریہ پھیل گئے تھے، وہاں کے مذہبی اور علمی طبقوں میں یہ سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ ہندوستانی بولیوں کی کثرت میں یہ وحدت کا کام دیتی تھی۔

رفتہ رفتہ سنسکرت کا رواج بھی کم ہونے لگا۔ اس کے کئی سبب تھے۔ پہلا یہ کہ اس نے مذہب کو اپنی آغوش میں جگہ دی۔ اس لئے برہمنوں کے حلقوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ دوسرا یہ کہ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں ہر زبان کا مقدّر یہی ہے کہ وہ تھوڑے عرصہ میں خواص کی زبان بن جائے لیکن اس کے زوال کا سب سے بڑا سبب وہ مذہبی انقلاب تھا جس کے علم بردار مہابیر جین اور مہاتما گوتم بدھ تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے مذہبوں کی تلقین، اپنے یہاں کی مقامی بولیوں میں کی عوام نے اس کا استقبال کیا۔ اس طرح مذہب کا سہارا لے کر صوبجاتی بولیاں چمک اٹھیں اور سنسکرت سے ٹکر لینے لگیں۔ اس کے ردِّ عمل کے طور پر ویدک مذہب کے علم بردار اپنی زبان کی حفاظت اور زیادہ سختی سے کرنے لگے۔ سنسکرت رفتہ رفتہ ایک فرقہ کی زبان بن کر رہ گئی۔ سنسکرت کے زوال کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ویدوں کی زبان تھوڑی بہت منظم ہونے کے باوجود اتنی ٹھس اور بے لوچ

نہیں تھی جتنی کہ سنسکرت۔ اپنی اہلیت کی وجہ سے اس نے دیو بانی (الہٰی زبان) اور امر بانی کا مرتبہ تو پایا، لیکن یہ امر پن، اس کے لیے بار بن گیا۔ ادھر اس کی دوسری بہن (پراکرت) جو رانی بن کر عوام کی گود میں پلی جس نے آریوں کے علاوہ غیر آریوں کو بھی سمیٹا، مروّجہ زبان کی ماں بن بیٹھی، استعارہ میں یہی بات یوں کہی جائے گی کہ زبان کا جو دھارا آریوں کے وقت سے بہنا شروع ہوتا ہے اس کی ایک شاخ جھیل کی شکل اختیار کر لیتی ہے، حسین لیکن محدود، جسے ہم سنسکرت کہتے ہیں، جس کے اردگرد اس کی گرامر کے سنگین ساحل پھیلے ہوئے ہیں۔ اس دھارے کی دوسری شاخ مختلف روپ بدلتی ہوئی اب تک بہہ رہی ہے۔ کبھی گدلی کبھی تابناک، لیکن ہر لحظہ پھیلتی ہوئی۔ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کا تعلق براہِ راست دھارے کی اسی شاخ سے ہے۔ مختصر یہ کہ آریوں کی ابتدائی زبان (جو دیسی بولیوں کے میل سے بنی تھی) ہی سے ویدک زبان اور سنسکرت پیدا ہوئیں اور دوسری صوبجاتی بولیاں پراکرتیں بھی پھوٹیں۔ سنسکرت نے صرف چنے ہوئے شائستہ اور بلیغ الفاظ سے اپنا خزانہ بھرا لیکن صوبائی بولیوں نے ویدک زبان کے فطری رجحان کو اپنایا یہی اُن کے پراکرت (فطری) کہلانے کا سبب ہے۔ اس طرح ویدک زبان اور پراکرتوں میں سنسکرت کی بہ نسبت زیادہ قریب کا رشتہ دکھائی دیتا ہے۔

انھیں پہلی پراکرتوں کی ادبی شکل کو پالی کا نام دیا گیا ہے۔ پالی کے نمونے یا تو بدھوں کی مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں یا پھر اشوک کی لاٹوں پر جو جنوب میں گنجم کے مقام سے لے کر یوسف زئی کے علاقہ میں شہباز گڑھی تک پائی جاتی ہیں۔ ان لاٹوں کی تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ اشوک کے زمانے میں کم از کم دو زبانیں رائج تھیں۔ ایک مشرقی اور دوسری مغربی۔ مغربی پراکرت پر سنسکرت کا

اثر گہرا نظر آتا ہے۔ اس کی نمایاں شکل شورسینی پراکرت تھی۔ مشرقی پراکرت ماگدھی کہلاتی تھی۔ اس زمانے تک کسی ایسی پراکرت کا پتہ نہیں ملتا جسے دکھنی پراکرت کہا جا سکے۔

(ب) عہدِ وسطیٰ (۵۰۰ ق۔م تا سنہ ۶۰۰ء) دوسری یا ادبی پراکرتیں

اس عہد میں لسانی ارتقا کی دو نمایاں شکلیں نظر آتی ہیں۔ ایک طرف تو سنسکرت جو باعتبار صوتیات اور صوریات ابھی تک قدیم آریائی زبانوں سے رشتہ جوڑے ہوئے تھی لیکن جس کی نحو اور فرہنگ سے روحِ عصر بھی جھلکتی تھی علمی اور ادبی طبقوں پر دھاک جما رہی تھی۔ دوسری طرف بُدھ اور جین متوں کا سہارا لے کر عوام کی بولیاں تیزی کے ساتھ ادبی پراکرتوں کی شکلیں اختیار کر رہی تھی۔ ان پراکرتوں کے ابتدائی حالات کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ البتہ پالی ہی کے اندر اُن کے درشن دکھائی دیتے ہیں۔ اس عہد کی ادبی پراکرت کی پانچ واضح شکلیں نظر آتی ہیں۔

(۱) مہاراشٹری:- ادبی حیثیت سے اس زمانے میں اِس پراکرت کو سب سے زیادہ فروغ حاصل تھا۔ اس عہد کا بیشتر شعری ادب اسی پراکرت میں ملتا ہے۔ عہدِ پراکرت کے قواعد نویسوں نے اسے نمونہ مانا ہے۔ لیکن جدید تحقیق کی رو سے مہاراشٹری پراکرت کو ملک دکن سے کوئی نسبت نہیں بلکہ یہ شورسینی پراکرت کی ایک جدید اور ترقی یافتہ شکل تھی۔

(۲) شورسینی:- اس کا مرکز شورسین دیس (دوآبہ کا وسطی حصہ، متھرا) تھا۔ سنسکرت کے بعد اعلیٰ طبقہ میں اگر کسی پراکرت کا رواج تھا وہ یہی تھی جس پر سنسکرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں بھی

اس کی جھُٹ پُٹی جھلک ملتی ہے۔ در اصل دو آبے کے علاقہ میں سنسکرت اور شورسینی پراکرت دونوں پروان چڑھتی ہیں اس لیے دونوں میں نہایت گہرا رشتہ نظر آتا ہے۔ ۶۰۱ء سے پہلے ہی اس نے مسلّم ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

(۳) ماگدھی:۔ مگدھ دیس (جنوبی بہار) کی پراکرت تھی چونکہ یہ آریائی تہذیب و تمدّن کے مرکزوں سے دور جا پڑی تھی، اس لئے ایک غیر مہذب زبان سمجھی جاتی تھی۔ بعض مصنّفوں نے اس پراکرت کو پالی خلط ملط کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ امر تحقیق شدہ ہے کہ پالی کا یہ نام (ماگدھی) سب سے پہلے سیلون (سری لنکا) کے بدھوں میں پڑا تھا جو ہندوستانی لسانیات کے نازک اختلافات سے ناواقف تھے۔

(۴) اردھ ماگدھی:۔ شورسینی اور ماگدھی پراکرتوں کے درمیانی علاقے کی زبان اس نام سے مشہور تھی۔ آج اسی علاقے کو دلی والے 'پورب' کے نام سے پکارتے ہیں۔ گوتم بدھ اور مہابیر جین دونوں نے اسی پراکرت کو اپنایا تھا۔ اس کا رواج اس زمانے میں شاہی خاندان تک میں تھا۔ زبان ہونے کی وجہ سے یہ دوسری پراکرتوں پر بھی اثر انداز ہوئی۔ تاریخ سے اس بات کا وافر ثبوت ملتا ہے کہ دوآبہ کے رہنے والوں کو اس کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ یہ اس وقت معیاری زبان تھی۔

(۵) پشاچی:۔ (پشاچ = کچا گوشت کھانے والے) یہ پنجاب کے علاقے کی پراکرت تھی۔ یہ اتنے دھند لکے میں تھی کہ عوام میں بھوت پریت کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ عہدِ قدیم کے قواعد نویس وررُچی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ گریرسن نے بھی رام شرما کی تحریروں کے اس حصّے پر کافی زور دیا ہے جس میں پشاچی کا ذکر ہے۔ کشنوں کے عہد میں (۱۰۱ء تا ۳۰۰ء) شمال مغربی ہندوستان کی اس پراکرت کو فروغ حاصل ہوا۔ اس زمانے میں شاہی سرپرستی کے تحت "گندھارا"

کی بولی ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت سے اِس علاقے میں رائج ہو گئی تھی اور ٹکسلا کا دارالعلوم اس وقت سارے ہندوستان کے لیے علم و ادب کا مرکز بن گیا تھا۔

(ج) عہدِ جدید (۶۰۰ء ، ۱۰۰۰ء) :

اَپ بھرنش اور جدید آریائی زبانیں

لسانیات کا یہ ایک اٹل اصول ہے کہ بول چال کی زبان جتنی تیزی سے بدلتی ہے، ادب کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چنانچہ جب پراکرتوں نے ادبی زبان کی شکل اختیار کرنی شروع کی، تو وہ عوام کی ڈگر سے پرے جا پڑیں، اور عوام کی زبان کا دھارا آگے بڑھتا رہا۔ اِسی بول چال کی زبان کو اس عہد کے قواعد نویسوں نے "اَپ بھرنش"، (یعنی بگڑی زبان) کہا ہے۔ یہ چھٹی صدی عیسوی میں تحریری کاموں میں آنے لگی تھی۔ اَپ بھرنش میں تصنیفات کا سلسلہ چھٹی سے لے کر چودھویں بلکہ پندرہویں صدی عیسوی تک ملتا ہے۔ حالانکہ گیارہویں صدی عیسوی ہی سے جدید آریائی زبانوں کا طلوع سمجھنا چاہیئے۔

شروع شروع میں لفظ اَپ بھرنش کسی خاص زبان کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ پڑھے لکھے لوگ اَن پڑھوں کی زبان کو اَپ بھرنش یا اَپ بھاشا کہا کرتے تھے۔ آریہ لوگ اپنی زبان کے معاملے میں بڑے کٹر واقع ہوئے تھے۔ سنسکرت میں، ملیچھ، اَپ بھرنش لفظ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ اَپ بھرنش کو ملک کی زندہ زبان پاکر بالآخر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پورب کی زبانوں تک نے اس کے اثر کو قبول کیا۔ لیکن گجرات، راجپوتانہ اور دوآبہ میں بولی جانے والی زبانوں پر اس کی چھاپ گہری پڑی۔ چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں

دوآبہ کی شورسینی اَپ بھرنش ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی تھی۔ اس کا بڑا سبب راجپوتوں کا سیاسی اقتدار تھا۔ جن کا مرکز اس وقت گنگا کی ترائی میں شہر کا نہیہ کبجا (قنوج) تھا۔ اس کے علاوہ گجرات کے جینیوں نے بھی اس کو بڑی ترقی دی۔ اس وقت اَپ بھرنش کی تین نمایاں قسمیں تھیں۔

(۱) ناگر اَپ بھرنش :۔ جو گجراتی اور راجستھانی کی قدیم بولیوں سے نکلی تھی۔ لیکن جس پر شورسینی کا اس قدر گہرا اثر پڑا تھا کہ وہ اسی کی شاخ معلوم ہوتی تھی۔ اس اَپ بھرنش کو خاص اہمیت یوں حاصل تھی کہ یہ علمی طبقہ میں مقبول تھی۔ ہندی رسم الخط کا نام ناگری اسی کی رعایت سے پڑا ہے۔ خود اس کا "ناگر" نام گجرات کے ناگر برہمنوں کی نسبت سے پڑا ہے۔

(۲) براچڈ :۔ یہ سندھ میں رائج تھی۔ موجودہ سندھی زبان اسی سے نکلی ہے۔

(۳) اُپ ناگر :۔ یہ ناگر اور براچڈ کے میل سے بنی تھی اور اس کا رواج مغربی راجپوتانہ اور دکھنی پنجاب میں تھا۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ اَپ بھرنش کی اتنی ہی قسمیں تھیں جتنی کہ پراکرت کی۔ لیکن ان کے نمونے نہیں ملتے۔

یہاں یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ پورب میں اشوک کے بعد وہاں کی زبان نے بالکل ترقی نہیں کی۔ کم از کم ماگدھی پر تو تاریخی سایہ آہی جاتا ہے۔ یہ ایک مزیخ زبان سمجھی جانے لگی تھی۔ اَردھ ماگدھی اور ماگدھی دونوں کے علاقے میں شورسینی ہی ادبی زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ اس زمانے

میں پورب کے شاعر اپنی زبان کو تج کر شورسینی اَپ بھرنش ہی میں شاعری کرتے تھے۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک قائم رہا۔ دسویں سے تیرھویں صدی تک کی پرانی بنگلہ شاعری میں بھی شورسینی کا اثر جھلکتا ہے۔ بہار کے مشہور شاعر ودّیاپتی نے اپنی زبان میتھلی کے ساتھ ساتھ اوہٹ میں بھی شاعری کی ہے۔ یہ اوہٹ، شورسینی اَپ بھرنش ہی کا ترقی یافتہ روپ تھا۔ ادھر برج بھاشا کو بھی اسی اَپ بھرنش کی وراثت ملی تھی۔ جسے اب کھڑی بولی چھین رہی ہے۔ اس طرح شورسینی اَپ بھرنش اس وقت لنگوا فرنیکا کی حیثیت رکھتی تھی اور گجرات و پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی۔

رفتہ رفتہ یہ اَپ بھرنش بھی ادبی زبان بن کر رہ گئی۔ اپنے آخر دور میں (۱۰۰۰ء) یہ بہت کچھ موجودہ بولیوں کے قدیم روپ سے ملتی جلتی ہے صحیح صحیح یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ اَپ بھرنش کس سنہ میں ختم ہوتی ہے اور جدید بولیاں کب طلوع ہوتی ہیں۔ لسانی تبدیلیاں نہایت چپکے اور چھپ کے رونما ہوتی ہیں۔ صرف اندازاً کہا جاسکتا ہے کہ جدید آریائی زبانوں کا طلوع ۱۰۰۰ء سے ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑے سیاسی اُلٹ پھیر کا زمانہ تھا۔ مسلمان بجلی کی طرح آناً فاناً شمالی ہند کو زیر کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ ان کے جلو میں ایک نیا تمدّن اور ایک نئی زبان آرہی تھی جس نے سنسکرت کے فسوں کو توڑ کر بہت جلد ہندوستان کی نئی زبانوں کو اپنے بل پر کھڑا ہونا سکھایا۔ دراصل ہندوستان کا لسانی نقشہ سیاسی اُلٹ پھیر کے ساتھ ساتھ ہمیشہ بدلتا رہا ہے۔ مسلمانوں کی فتوحات ہی کے طفیل میں آج دوآبے کی ایک چھوٹی سی بولی (کھڑی بولی) ہندوستان کی لنگوا فرنیکا بنی ہوئی ہے۔

۲- ہندوستان کی جدید زبانوں کی گروہ بندی

ہرنلے (HOERNLE) کے اس مفروضے کی بنا پر کہ آریہ قبائل ہندوستان میں دو مختلف گروہوں میں داخل ہوئے تھے۔ گریرسن نے ہندوستان کی آریائی زبانوں کو دو شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک اندرونی اور دوسری بیرونی، اندرونی شاخ سے تعلق رکھنے والی زبانیں ٹھیک اس علاقہ میں بولی جاتی تھیں۔ جس کا ذکر ہم' مدھ دیش' کے نام سے کرتے آئے ہیں۔ بیرونی زبانوں کا سلسلہ نصف دائرے کی شکل میں مغربی پنجاب سے شروع ہو کر سندھ، مہاراشٹر، وسطی ہندوستان، اڑیسہ، بہار اور بنگال تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سلسلے کی کڑی صرف گجرات میں ٹوٹتی ہے جہاں کی زبان متھرا والوں کے سیاسی اقتدار کی بنا پر شورسینی سے حد درجہ متاثر نظر آتی ہے۔ گریرسن نے اپنی اس تقسیم کو لسانی دلائل کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس بارے میں بغیر تفصیلی جائزہ لیے ہم ڈاکٹر چٹرجی کی اس رائے سے متفق ہیں کہ "جدید آریائی زبانوں کی اندرونی اور بیرونی شاخوں میں تقسیم، لسانی اعتبار سے اسی قدر مہمل ہے جتنی کہ تاریخی اعتبار سے" جدید تحقیق کی روشنی میں ان زبانوں

کی گروہ بندی حسب ذیل طریقے پر کی جا سکتی ہے۔

(الف) شمالی: (۱) سندھی (۲) لہندا (۳) پنجابی
(ب) مغربی: (۴) گجراتی (۵) راجستھانی
(ج) درمیانی: (۶) مغربی ہندی
(د) مشرقی: (۷) مشرقی ہندی (۸) بہاری (۹) اُڑیا
(۱۰) بنگالی (۱۱) آسامی
(ہ) جنوبی: (۱۲) مرہٹی

ان کے علاوہ پہاڑی علاقے کی زبانیں بھی ہیں، جو راجستھانی سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔

ان زبانوں میں سے اُردو کا تعلق براہِ راست مغربی ہندی سے ہے جس کی پانچ بولیاں ہیں:۔

(۱) ہندوستانی (کھڑی بولی)
(۲) برج بھاشا
(۳) بندیلی
(۴) ہریانی یا بانگڑو
(۵) قنوجی

قنوجی دراصل برج بھاشا ہی کی ایک شکل ہے۔ ان بولیوں میں برج بھاشا کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ یہ شورسینی پراکرت اور شورسینی اَپ بھرنش کی سچّی جانشین تھی۔ اس کا مرکز متھرا ہے۔ جنوب میں یہ آگرہ، بھرت پور، دھول پور، گوالیار اور جے پور تک بولی جاتی ہے۔ شمال اور شمال مشرق میں ضلع گوڑگاؤں، علی گڑھ، بلندشہر، ایٹہ، مین پوری، بدایوں، بریلی اور نینی تال کے

ترائی پرگنوں تک رائج ہے۔ اُردو ہندی سے قبل یہ اِس علاقے کی مانی ہوئی ادبی زبان بھی شاید اسی وجہ سے آزاد نے اُردو زبان کا رشتہ برج سے ملایا ہے۔

جمنا کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب مشرقی پنجاب میں ہریانی یا بانگڑو بولی جاتی ہے۔ اِس زبان کے متعلق تحقیق بہت کم ہوئی ہے حالانکہ قدیم اردو کے بنانے میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ دکنی زبان کی وہ خصوصیات جن کی توضیح پروفیسر شیرانی نے پنجابی سے کی ہے، کافی حد تک اس بولی سے بھی کی جاسکتی ہیں۔

مغربی ہندی کی وہ بولی جو مغربی روہیلکھنڈ، دوآبہ اور پنجاب کے ضلع انبالہ میں بولی جاتی ہے۔ عرف عام میں کھڑی بولی کے نام سے مشہور رہے گریرسن نے سب سے پہلے اِس بولی کو ہندوستانی کا نام دیا ہے۔ اور "بولی ہندوستانی" اور "ادبی ہندوستان" (اُردو) میں امتیاز کیا ہے۔ اُردو اپنے ڈول اور کینڈے کے اعتبار سے مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کی بہ نسبت اس سے زیادہ قریب ہے۔ چنانچہ یہ متفقہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اُردو اس بولی سے نکلی ہے جو مذکورہ بالا علاقہ میں قدیم زمانے سے بولی جاتی ہے اور جو کئی لحاظ سے ایک طرف پنجابی سے مختلف ہے تو دوسری طرف برج بھاشا سے، جس کے ارتقاء میں مختلف زمانوں میں مختلف بولیوں نے حصہ لیا ہے لیکن جس کے مستقل وجود کی نشاندہی قدیم زمانے سے کی جاسکتی ہے۔

امیر خسرو نے اپنی فارسی مثنوی نہ سپہر میں اس کا تعین "زبانِ دہلی و پیرامنش" (دہلی اور اس کے نواح کی زبان) سے کیا ہے۔ اُردو کے مولد و منشاء کی تلاش کی یہی سب سے بڑی کلید ہے۔

۴۔ ہندوستانی (اُردو) زبان کا عہد بہ عہد ارتقا

مغربی ہندی (اور اس کی بولیوں کھڑی، برج وغیرہ) کی قدامت کا سب سے بڑا ثبوت وہ قدیم لسانی شہادتیں ہیں جو ہمیں مسلمانوں کی فتح دہلی سے فوراً قبل یا بعد کے نمونوں میں ملتی ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں نہایت ذہانت سے چندکوی اور خسرو کے ہندوی کلام پر تردیدی قلم اُٹھایا ہے اور اس طرح اپنے دعوے کو مستحکم بنانے کی کوشش کی ہے۔ کھڑی بولی یا اُردو (بلکہ ہریانی بھی) اُن کے خیال کے مطابق مسلمانوں کے داخلۂ دہلی کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اور ایک طرح سے وہ مسلمانوں کے اس قافلہ کی مرہونِ منت ہیں جو لاہور سے دہلی ہجرت کرتا ہے۔

کھڑی بولی کی قدامت کو پھر سے قائم کرنے کے لیے ہم ہندی ادبیات سے بعض ایسے نمونے پیش کریں گے جو مسلمانوں کے داخلۂ دہلی سے پہلے کے ہیں۔ دراصل مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کی شکلیں ہمیں اَپ بھرنش کے ادبی نمونوں تک میں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ اپنے اشعار کو عام فہم بنانے کے لیے شاعروں

کا ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ وہ شاعری کی قدیم روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مروّجہ زبان کا پٹ اپنی زبان میں لے آتے ہیں۔ اَپ بھرنش عہد میں دیوسین نام کا ایک جین مصنف ہوا۔ اس نے جو دوہے نقل کیے ان میں حسب ذیل الفاظ بلا تکلف استعمال ہوئے ہیں۔

جو۔ جن۔ بھاشیو۔ (کہنا) کہیو۔ کری۔ پاوی۔ پارو (پار)

اسی زمانے میں بدھ دھرم اپنی بگڑی ہوئی شکل میں ملک کے مشرقی حصّوں میں عرصے سے پھیلا ہوا تھا۔ بہار میں نالندا کی مشہور درس گاہ بدھ سدّھوں کا اڈا تھا۔ بختیار خلجی نے جب ان مقاموں کو اُجاڑا تو یہ تتر بتر ہو گئے۔ اِن بدھ سدّھوں نے عوام پر اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے سنسکرت کی تصانیف کے ساتھ ساتھ اَپ بھرنش ملی ہوئی "دیس بھاشا" میں بھی دوہے لکھے ہیں۔ اُن میں سب سے پرانے "سرہ" ہیں، جن کا زمانہ ۶۸ء کا ابتدائی عہد ہے۔ انھوں نے زبان کی حسب ذیل صورتیں اپنے دوہوں میں استعمال کی ہیں۔

نہ۔ ناہیں۔ کہیا۔ اندھارے۔ وری آ۔ فعل کہیا کا خاتمہ "آ" پر ہے۔

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف پنجابی زبان کی خصوصیت نہیں، جیسا کہ شیرانی نے زور دیا ہے، بلکہ اس زمانے کی مروّجہ زبان ہے۔ کہیا اور کہیو دونوں شکلیں رائج تھیں۔ برج بھاشا نے کہیو کی شکل کو اپنایا اور کھڑی اور ہریانی نے "آ" کی شکل اختیار کر لی۔

"آ" آواز کی مزید مثالیں سرھ "کوی پا" کے یہاں ذیل کے الفاظ میں ملتی ہیں۔ ایک شعر میں۔ کری آ۔ پوچھیا کی ترکیبیں ملتی ہیں جو قدیم دکنی میں بھی پائی جاتی ہیں۔

سدھ "برو پا" کے یہاں بھی "دیکھ اِیا" ملتا ہے۔ دیگر سدھوں کی تحریروں میں جو۔ سو۔ ماریا۔ جا۔ جاب (جب) تاب (تب) کوئی وغیرہ کے الفاظ ملتے ہیں۔

ہیم چندر جو کہ اسی عہد کے مشہور گجراتی جین عالم تھے، اپنی قواعد میں ایک دوہا دیتے ہیں جس کا پہلا مصرعہ حسب ذیل ہے ع

بھلا ہوا جو ماریا بہنی مھارا کنتُ (بھلا ہوا جو مارا گیا اے بہن ہمارا پیارا)

اَپ بھرنش کے عہد کے دوسرے نامور شاعر سوری، ددیا دھر اور شارنگ ہیں جن کے یہاں ذیل کے الفاظ بے تکلّف ملتے ہیں۔

بجیا (بھاگا) لگیا۔ چلیا۔

اَپ بھرنش عہد کے بعد ہندی ادب کا وہ دور آتا ہے جسے "ویر گاتھا" کہا جاتا ہے۔ "پرتھوی راج راسو" جسے شیرانی جعلی کتاب بتاتے ہیں اسی عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ "راسو" کے متعلق تفصیلی بحث کرنے کا یہ موقع نہیں صرف اس قدر ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ راسو کے بعض حصّے اتنے ہی قدیم ہیں جتنا کہ کہا جاتا ہے۔ راسو کے اس حصّے میں بھی کھڑی بولی کی شکلیں نظر آجاتی۔ اس میں عربی اور فارسی کے یہ الفاظ بھی ملتے ہیں۔

سوار۔ شہنائی۔ عربی۔ ترکی اور کمان

جنھیں اَپ بھرنش یا قدیم زبان کے صوتی اصولوں کے مطابق اسوار۔ شہنائی۔ عربیّ۔ ترکیّ۔ اور کمّان لکھا گیا ہے۔

امیر خسرو۔ (۱۲۵۲۔۱۳۲۵ء) پرتھوی راج کے قتل ہونے کے نوّے برس بعد خسرو نے شاعری شروع کی جو نہایت صاف

اور سادہ اُردو میں ہے۔ پون صدی کے اندر پنجابی مسلمانوں کے زیر اثر دلّی اور اس کے آس پاس ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا ایک حیرت انگیز کرشمہ کہلائے گا۔ دراصل برج اور کھڑی کی جن شکلوں کو ہم اپ بھرنش میں دیکھ آئے ہیں اس کا پورا نکھار خسروؔ کے یہاں ہو جاتا ہے۔ راسو اور خسروؔ کے درمیان فارسی رسم الخط میں ادب کا کوئی نمونہ نہیں ملتا۔ ہندی رسم الخط میں جو نمونے ملتے ہیں وہ برج کی ابتدائی شکل کا پتہ دیتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں کی دھاریں قدیم زمانے سے بہہ رہی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ اپ بھرنش کی شاعری کا ڈھانچہ جب بگڑنا شروع ہوتا ہے تو برج یا پنگل کی شکل لے لیتا ہے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ خسروؔ نے بحیثیت ایک ماہر لسانیات کے زبان کا سب سے چلتا ہوا روپ اپنی پہیلیوں اور مکرنیوں کے لیے منتخب کیا ہوگا یعنی وہ زبان جو عام طور سے اس وقت دلّی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی تھی لیکن چونکہ اس وقت دلّی اور اس کے نواح میں برج ادبی زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ اس لئے خسروؔ ہمیشہ خالص کھڑی میں نہ لکھ سکے بلکہ اکثر اوقات انھوں نے شاعری کی معیاری زبان یعنی برج سے متاثر ہو کر اپنی زبان کو ملواں بنا دیا ہے۔ آج بھی کھڑی بولی کے علاقے میں برج بھاشا کی مکرنیاں اور پہیلیاں عام طور سے مروج ہیں۔ چنانچہ خسروؔ کے ادب کا جائزہ لیا جائے تو اس میں دو قسم کی زبان ملتی ہے ٹھیٹھ کھڑی بولی، جو اکثر پہیلیوں، مکرنیوں اور دوسخنوں میں ملتی ہے اور گیتوں کی زبان جو عام فہم برج بھاشا میں ہیں۔ اس سے خسروؔ کو کبیرؔ کی طرح مفر نہ تھا۔ لیکن خسروؔ کے سلسلے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ ان کا ہندوی کلام مستند نہیں جب کہ وہ ہندوی کے شاعر مسلّمہ طور پر تھے۔

نامدیو۔ کبیر اور نانک:۔ اسی عہد (چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی) کے دوسرے شاعر نامدیو، کبیر اور نانک ہیں۔ مسلمانوں کے لشکروں کے ساتھ دلّی اور اس کے نواح کی بولی پورب پچھم اور دکنی ہندوستان میں پھیل جاتی ہے۔ اس زبان کی شکل نامدیو (مرہٹی شاعر ۱۳۲۰-۱۴۵۸) کے یہاں دیکھئے:۔

مائی نہ ہوتی، باپ نہ ہوتے، کرم نہ ہوتا کایا
ہم نہیں ہوتے، تم نہیں ہوتے، کون کہاں تے آیا
چند نہ ہوتا، سور نہ ہوتا، پانی پون ملایا
شاستر نہ ہوتا، وید نہ ہوتا، کرم کہاں تے آیا

اس کھڑی بولی کا روپ کبیر (پندرھویں صدی عیسوی) اور گرو نانک (پندرھویں صدی عیسوی) کے یہاں دیکھئے۔ ایک پورب (بنارس) کا رہنے والا ہے اور دوسرا پنجاب کا۔

کبیر:۔
کبیرا کہتا جات ہوں سنتا ہے سب کوئے
رام کہہ بھلا ہوگا، نہیں تو بھلا نہ ہوئے
آؤں گا نہ جاؤں گا مروں گا نہ جیوں گا
گرو کے سبد رم رم رہوں گا

نانکؒ:۔
اس دم دا میں تو کیہے بھروسہ، آیا آیا نہ آیا آیا
یہ سنسار رین دا سپنا، کہیں دیکھا کہیں ناہیں دکھایا
سوچ وچار کرے مت من میں جس نے ڈھونڈا اس نے پایا
نانک بھگتن دے پد پرسے نس دن رام چرن چت لایا

نامدیو، کبیر اور نانک کے اقتباسات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ برج، کھڑی اور ہریانی ان سب بولیوں کے بیچ اس وقت کی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ برج کو اس وقت ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ رفتہ رفتہ شورسینی زبان کی وہ روایات غالب آجاتی ہیں جن کا تعلق کھڑی بولی اور ہریانی سے تھا اس کی وجہ ظاہر ہے۔ دلّی اس وقت دارالسلطنت تھی جو کہ ان بولیوں کے علاقے میں ہے ابتدا میں کھڑی بولی برج بھاشا کی گود میں نظر آتی ہے۔ بعد کو خاص طور سے مسلمان صوفیاء کی سرپرستی میں یہ ایک علیٰحدہ ادبی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ دراصل مسلمانوں کے داخلۂ دلّی کی تاریخ جدید آریائی زبانوں کے طلوع کی تاریخ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مشرقی پنجاب، نواح دلّی اور دوآبے کی زبان میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔ اس علاقے کی زبانیں اِس وقت ارتقائی منزلوں سے گذر رہی تھیں جن کا مکمل نکھار ہم کئی صدیوں کے بعد پاتے ہیں۔ اسی خام حالت میں مسلمان لشکری اس کو چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں دکن لے کر گئے، جہاں وہ زبانوں کے اجنبی ماحول میں ارتقائی منزلیں طے نہ کر سکی۔ دلّی کی قدیم زبان اور دکنی زبان میں زیادہ فرق نہ تھا لیکن شمال میں لسانی تبدیلیوں کی رفتار تیز رہی۔ چنانچہ جب وَلی اپنی دکنی بولتے ہوئے دلّی میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں ایک ترقی یافتہ زبان سے سابقہ پڑتا ہے جس کی شہادت خود ان کے دیوان سے ملتی ہے۔ ۱۳۰۰ء تا ۱۷۰۰ء چارسو سال میں دکن میں اردو کا ارتقا جس انداز پر ہوا اس کا اندازہ دکنی ادب کے ان وافر نمونوں سے کیا جاسکتا ہے جو اس صدی میں محققین کی کوششوں سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ لسانی نقطۂ نظر سے دکنی کا علاقہ، مہاراشٹر، آندھرا، کرناٹک کی ریاستوں پر مشتمل ہے۔ ان علاقوں میں مرہٹی، تلگو اور کنڑ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مرہٹی کے

علاوہ باقی سب زبانوں کا تعلق دراویدی خاندان السنہ سے ہے۔ اس لیے دہلی کی زبان دکن پہونچ کر زبانوں کے اجنبی ماحول میں ایک علیحدہ ڈگر پر پنپتی رہی دکن میں خسرو کی "زبانِ دہلی" کا پہلا مرکز دولت آباد تھا، جو مرہٹی کے علاقے میں ہے۔ ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت کے قیام کے ساتھ دکنی کا مرکز کنڑ کے علاقے میں گلبرگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ سلطنتِ بہمنیہ کے جب ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں، تو دکنی کے دو نئے مرکز پیدا ہو جاتے ہیں: تلگو علاقے میں گولکنڈہ (حیدرآباد) اور کنڑ کے علاقے میں بیجاپور۔ دکنی ادب انھیں دونوں دبستانوں میں اپنے کمال کو پہنچتا ہے اور دہلی کی خام زبان قلی قطب شاہ، وجہی اور نصرتی کے ہاتھوں میں ادبی سطح کی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ دہلی کی قدیم زبان کا رُخ دکنی کے آئینے سے جھلکتا ہے۔

دکن میں اُردو (۱۳۰۰ تا ۱۷۰۰ء)

اُردو پیدا ہوئی دہلی اور اس کے نواح میں لیکن ادبی حیثیت سے، بعض تاریخی وجوہ کی بناء پر یہ پروان چڑھی دور دراز دکن میں جہاں یہ پہلی بار فتوحاتِ علائی کے ذریعے چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں پہنچی۔ محمد بن تغلق نے ۱۳۲۷ء میں دولت آباد کو دارالسلطنت بنانے کی ناکام کوشش کر کے اس کے قدم نواح اورنگ آباد میں اچھی طرح جما دیئے اور پھر بالآخر سلطنتِ بہمنیہ کے قیام کے بعد (۱۳۴۷ء) سے تو اس کا چلن مرا ٹھی، تلگو اور کنڑ کے علاقے میں روز بروز بڑھتا گیا۔ چودھویں صدی سے اس میں مسلسل تصانیف کا سلسلہ ملتا ہے جو ۱۷۰۰ء بلکہ اس کے بعد تک جاری رہا۔ اس کی پہلی مستند تصنیف فخر دین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" (لگ بھگ ۱۴۳۴ء) ہے اور آخری ادبی

کارنامہ ابراہیم بیجاپوری کی "دکھنی انوار سہیلی" (۱۷۲۴) ہے۔

شمالی ہند کی طرح دکن میں یہ پہلے ہندی، ہندوی اور زبانِ ہندوستانی (سب رس)، کے ناموں سے یاد کی جاتی رہی۔ اس کا دکنی یا دکھنی نام تو سترھویں صدی میں جاکر پڑا۔ دکنی اُردو کے بارے میں بعض محققین کا یہ خیال کہ اس کا مرزبوم دکن ہے محض قیاس آرائی ہے۔ دکنی اُردو خسرو کے "زبانِ دہلی و پیرامنش" (زبانِ دہلی اور اس کے نواح کی زبان) کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کلاسیکی دکھنی میں تلگو اور کنڑ کے الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں اور مراٹھی کے بھی مخصوص الفاظ وہ ہیں جن کا سلسلہ ہند آریائی رشتے سے نواحِ دہلی کی بولیوں سے ملایا جاسکتا ہے۔ دکنی اردو کے تمام تر لغات ہند آریائی ہیں یا پھر عربی، فارسی اور اس کے صرف و نحو کی ساخت کے ماخذ نواحِ دہلی کی بولیاں ہیں۔

دکنی اردو کی صوتیات کی نمایاں خصوصیات حسبِ ذیل ہیں۔

(الف) طویل مصوتوں کے بجائے مختصر مصوتوں کا استعمال مثلاً اَسمان، اَدمی، اَنکھ،

(ب) مشدّد الفاظ کی کثرتِ استعمال مثلاً سنّا (رونا) سُکّا (سوکھا) ہتّی (ہاتھی)

(ج) ہکاریت یا ہائیت کا، مخلوط اور غیر مخلوط دونوں شکلوں میں حذف مثلاً: کاں (کہاں)، یاں (یہاں)، تمیں (تمہیں) مورک (مورکھ)، راک (راکھ)، کچ (کچھ) مج (مجھ) دود (دودھ)

ایک طرف ہائیت کے حذف کا رجحان ملتا ہے تو دوسری طرف اس کے غیر ضروری اضافے یا تقلیب کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں: جیسے

بھنکڑی (پنکھڑی)، بھتر (پتھر) پچھاننا (پہچاننا) کھاندا (کاندھا)

(د) دو کوز آوازیں قریب قریب ہوں تو پہلی دندانی بن جاتی ہے مثلاً ٹیڑا (ٹیڑھا) تھنڈا (ٹھنڈا) داٹنا (ڈاٹنا) تٹو (ٹٹو) تاٹ (ٹاٹ)

حرف کی سطح پر جن خصوصیات کی بنا پر دکنی کی شناخت ہوتی ہے حسب ذیل ہیں۔

(الف) دکنی اردو میں مصمتوں پر ختم ہونے والے اسمار کی جمع "وں" کے بجائے (گو اس کی بھی مثالیں ملتی ہیں) عام طور "اں" کے اضافے سے بنتی ہے:

گھراں، راتاں، دوکاناں، کتاباں، لوگاں، دناں

(ب) دکنی اردو کے بعض اسمائے ضمیر موجودہ اردو سے مختلف ہیں:

مثلاً مج منج (مجھ)، ہمن ہمنا (ہم) توں (تو)، تمنا، تمن (تم) کئی (کوئی)

(ج) دکنی کے بعض اعداد بھی مختلف ہیں جیسے:-

یک، ایکس، ایکت (ایک)، بادیس، تیوبیس، ستادیس، اٹھادیس (۲۲، ۲۳، ۲۷، ۲۸) ترتالیس، چونتالیس (۴۳، ۴۴) چھتالیس، اپنجالیس (۴۶، ۴۹) نوّد (۹۰) اکیانو، بیانو، چورانو، پچانو چھانو، ستانو، اٹھانو، نانو (۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹)

(د) افعال کی سطح پر حسب ذیل خصوصیات قابل توجہ ہیں:

ماضی مطلق کی تشکیل میں "-ا" کے بجائے "یا" آتا ہے، جیسے، بولیا، چلیا، دیکھیا، سنیا، ماریا۔

مضارع اور حال کا مفہوم دینے کے لیے دکنی اردو میں نفی (نہ) کے ساتھ ایک شکل سی کی بھی ملتی ہے جو شمالی ہند کی اردو میں کبھی استعمال نہیں ہوئی

"اس کتاب کو سینے پرتے ہلا سی نا" (سب رس)

"عشق میں آئے بغیر خاطر جمع نہ ہوسں" (سب رس)

امدادی افعال میں، تھا، اور ہے، کے ساتھ "اتھا" اور "اہے" کی شکلیں بھی ملتی ہیں، جو شمالی ہند میں بھی رائج رہی ہیں۔

(۴) دکنی اُردو کے خاص حروف حسب ذیل ہیں۔

اتال (اب)، ہور (اور) پن (پر)، سوں، سیں، سی (سے) منیں (میں) اور سب سے مخصوص شکل "چ" تخصیص کی ہے جو راست مراٹھی سے لی گئی ہے۔ تمیچ (تم ہی) کرناچ (کرنا ہی) کھا۔ نیچ دکھاتے ہی) یہ "چ" تخصیصی اسماء، افعال اور حروف ہر ایک میں لگائی جا سکتی ہے۔

یہی صورت مراٹھی سے مستعار "نکو" (مراٹھی نکا) کی ہے جو "چ" کے ساتھ دکنی مخطوطات کے شناخت کی کلید ہے۔

صرف کے نقطۂ نظر سے معیاری اُردو اور دکنی کا نمایاں فرق یہ ہے کہ دکنی میں علامات فاعلی "نے" محذوف ہونے کی وجہ سے فعل، فاعل کے تابع ہوتا ہے نہ کہ مفعول کے، جیسا کہ جدید اُردو میں پایا جاتا ہے۔

دکنی اردو	اردو
لڑکا روٹی کھایا	لڑکے نے روٹی کھائی
لڑکا روٹیاں کھایا	لڑکے نے روٹیاں کھائیں
لڑکے روٹی کھائے	لڑکوں نے روٹی کھائی
لڑکے روٹیاں کھائے	لڑکوں نے روٹیاں کھائیں
—	—
لڑکی لڈو کھائی	لڑکی نے لڈو کھایا

لڑکی لڈواں کھائی — لڑکی نے لڈو کھائے
لڑکیاں لڈو کھائے — لڑکیوں نے لڈو کھایا
لڑکیاں لڈواں کھائے — لڑکیوں نے لڈو کھائے

(بحوالہ ہندوستانی صوتیات : محی الدّین قادری زور (انگریزی)

دکنی اُردو کی مذکورہ بالا خصوصیات نے اُردو کی ابتدا سے مطلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں۔ چونکہ ان میں اور پنجابی زبان کی صوتی وصرفی خصوصیات میں بعض مماثلتیں پائی جاتی ہیں اس لیے پروفیسر شیرانی قدیم اُردو اور پنجابی سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں (کھڑی، برج بھاشا اور ہریانی) کی لسانی ساخت کا علم ہے وہ اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں کہ "ج" تخصیصی اور چند مراٹھی کے الفاظ کو چھوڑ کر دکنی اُردو کی ایک بھی لسانی خصوصیت ایسی نہیں جس کی توجیح دہلی اور اس کی نواح کی مذکورہ بالا بولیوں سے نہ کی جا سکے۔ دکنی اُردو کا "پنجابی پن" اس کا "کھڑی پن" اور "ہریانی پن" بھی ہے۔ برج بھاشا کا پٹ جس قدر موجودہ اُردو میں ملتا ہے اسی قدر دکنی میں بھی۔

شمال میں اِسی زمانے کے پہلے مستند شاعر محمد افضل افضلؔ (متوفی ۱۶۲۵ء) کے بارہ ماسے کی زبان دیکھئے اور اس کے ارتقا کا اندازہ کیجئے۔

سکھی رے چیت رُت آئی سو آئی — اجھوں امید میری بر نہ آئی
رہے ہیں بھونرے پھولوں کے گلے لاگ — مرے سینے جدائی کی لگی آگ
سکھی دن رات مجھ ناگن ڈستا ہے — پھروں دوری تمامی جگ ہنستا ہے

'بارہ ماسے' کی زبان محمد قلی قطب شاہ اور وجہی کی زبان سے ارتقا کی کئی منزلیں آگے طے کر چکی ہے۔

دکن اور شمالی ہند کے لسانی اختلافات کی بہترین عکاسی ہمیں ولی کے دیوان میں ملتی ہے۔ دکنی کے توسط سے آپ بھرنش کی قدیم روایات سے وابستگی اور لسانی تبدیلیوں کا احساس دونوں پہلو یہ پہلو جھلکتے ہیں۔ یہی نہیں ہندی اور فارسی الفاظ کی آمیزش میں بھی دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت نظر آتی رہے ہے۔ دلی کی زبان میں جو پرانا پن جھلکتا تھا اس کے خلاف بالآخر اصلاحِ زبان کی تحریک دلی میں اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اُردو کی اس آخری اور ترقی یافتہ شکل متعین کرنے میں برج نے کافی حصّہ لیا۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیئے کہ آگرہ عرصے تک مغلوں کا دارالسلطنت رہا اور آگرہ کی زبان معیاری سمجھی جاتی تھی۔ شاہجہاں کی مراجعت دہلی (۱۶۴۸ء) سے "زبانِ دہلی" کا نشاۃ الثانیہ شروع ہوتا ہے جس کی تکمیل اورنگزیب کے عہد میں ہوتی ہے۔ اورنگزیب کے آخری دور میں اورنگ آباد دہلی کے درمیان لسانیاتی رشتے بہت گہرے ہوجاتے ہیں۔ غرض کہ اٹھارہویں صدی کے آغاز تک زبانِ دہلی نے ایک طرف برج کو زبان کے اکھاڑے سے نکال باہر کیا اور دوسری طرف بدیسی فارسی کو پچھاڑ لیا۔ سترھویں صدی کے اواخر ہی میں فارسی کے ہندوستانی شعرا کو اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ "ریختہ" کا ارتقا ادبی سطح تک ہوچکا ہے اور اس کے ادبی استعمال کو اور زیادہ ملتوی نہیں کیا جاسکتا۔ یہی زمانہ ہے جب کہ ہریانے کے علاقے میں درس و تدریس کی ضروریات کے تحت منظوم لغات لکھی جانے لگیں۔ میر عبدالواسع ہانسوی نے "غرائب اللغات ہندی" جو اردو کی پہلی لغت ہے "فائدہ عام" کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی۔ "فائدۂ عام" کا یہ تصوّر شہر دہلی نہیں بلکہ مضافاتِ دہلی میں پہلے پیدا ہوا۔ شہر دہلی میں اردو کی طرف لوگوں کی توجہ سنجیدگی کے ساتھ اس وقت منعطف ہوئی جب "باشندگانِ دکن"

جوق در جوق اپنے ادبی سرمائے کو لے کر دہلی پہنچے۔ نواب صدر الدین محمد خاں فائز نے اپنا اردو دیوان ۱۷۱۵ء میں مرتب کیا۔ فائز کے کلام سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ دہلی کی زبان اور انداز بیان پر دکنی کا سکہ بیٹھ چکا تھا لیکن جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے بہت جلد دہلی والوں کے یہاں دکنی زبان کے خلاف ردّعمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس تحریک کی قیادت مرزا مظہر جانجاناں کو حاصل تھی جو اس وقت دہلی کی ادبی اور روحانی تحریکوں کی جان تھے چنانچہ حاتم نے جب ۱۷۵۵ء میں اپنا قدیم کلیات سے رطب و یابس نکال کر "دیوان زادہ" مرتب کیا تو اصلاح و معیار زبان کے لیے بقول شاہ مبارک آبرو انھوں نے ان اصولوں کو پیش نظر رکھا۔

(۱) وقت جن کا ریختے کی شاعری میں صرف ہے
ان ستی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل اُس کے، ریختے میں حرف ہے

(۲) وہ عربی فارسی الفاظ استعمال کئے جائیں جو قریب الفہم اور کثیر الاستعمال ہوں۔

(۳) دہلی کا وہ روزمرہ استعمال کیا جائے جو فصیحوں کو منظور ہو۔

(۴) مختلف بولیوں کے وہ الفاظ جو "بھاکا" کے ہوں متروک۔

(۵) صرف وہ روزمرّہ جو "عام فہم" مگر خاص پسند ہو۔

چنانچہ ان اصولوں کے تحت تسبی پر تسبیح، صحی پر صحیح، بگانہ پر بیگانہ، مَرَض پر مَرْض کو تسلیم کیا گیا "نین دجگ دنت و لبھر"، جیسے الفاظ متروک قرار دیئے گئے بھاکا کے الفاظ کی بجائے عربی فارسی لفظ کھپائے گئے۔ مثلاً

نین کی بجائے چشم، ساجن کی بجائے معشوق، درشن کی بجائے دید، موہن کی بجائے معشوق، پیو کی بجائے دوست اور دِرہ کی بجائے فراق وغیرہ۔
میر و مرزا کی زبان میں ہندی کے متروک الفاظ اور دکنی زبان کے افعال کے جو پیوند نظر آتے ہیں اُن کی صفائی بالآخر لکھنؤ جا کر ناسخ کے ہاتھوں ہوتی ہے لکھنؤ کی اُردو باعتبار صوتیات اور قواعد کی بعض خصوصیات کے اودھی زبان سے متاثر نظر آتی ہے۔ دہلی والوں کو لکھنوی لہجہ اسی وجہ سے زنانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ اُردو ایک مردانہ زبان ہے اور اس کی صوتیات کا معیار لکھنوی لہجہ سے نہیں بلکہ دلّی اور اس کے نواح میں رہنے والوں کی صوتیات سے متعین ہوگا۔ یہ کھڑا لہجہ ہے جس کے صحیح تصور کے لیے برج اور اودھی بولیوں کا پس منظر ضروری ہے لیکن یہ ذہن میں رہے کہ یہ پنجابی کا کھڑا لہجہ نہیں۔ اس اعتبار سے اردو بین بین ڈولتی ہے۔
اُردو کا صرفی اور نحوی ارتقا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکمّل ہو چکا ہے۔ اس کی صوتیات اور لہجہ بھی لوگ کہتے ہیں کہ متعین ہو چکا ہے لیکن اردو کا مرکز اب لکھنؤ نہیں رہا دلّی بھی نہیں رہا۔ اس بے گھر کو گھر کہاں ملے گا؟

مرے وطن، مرے ہندوستاں، عزیز وطن!
تجھے بہشت کہا ہم نے اپنا گھر نہ کہا